

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

یورپ اسلام کے پھیلتے ہوئے اثرات

مع

صہیونی دہشت گردی کی تاریخ
سے چند صفحات

تالیف:

علامہ ڈاکٹر محمد اشرف آصف جلالی صاحب

ایم اے عربی، پی ایچ ڈی عربی

(فاضل جامعہ محمدیہ نوریہ رضویہ بھکھی شریف - فاضل بغداد یونیورسٹی عراق)

اویسی بک سٹال

ناشر:

جامع مسجد رضائے مجتبیٰ ایکس بلاک پیپلز کالونی گوجرانوالہ

﴿ جملہ حقوق محفوظ ہیں ﴾

الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ
وَعَلَى آلِكَ وَأَصْحَابِكَ يَا حَبِيبَ اللَّهِ

نام کتاب یورپ میں اسلام کے پھیلتے ہوئے اثرات

..... مع صہیونی دہشت گردی

تالیف علامہ ڈاکٹر محمد اشرف آصف جلالی صاحب

مرتب و پروف ریڈنگ محمد نعیم اللہ خاں قادری

تاریخ اشاعت اول جولائی ۲۰۰۵ء

کمپوزنگ رضوی کمپوزنگ سنٹر مکتبہ رضائے مصطفیٰ گوجرانوالہ

صفحات ۳۲

تعداد گیارہ سو

ہدیہ - روپے

ناشر اویسی بک شال پیپلز کالونی گوجرانوالہ

باہتمام شیخ محمد سرور اویسی 0333-8173630

ملنے کا پتہ :

❖ ضیاء القرآن پبلیکیشنز لاہور ❖ شبیر برادرز لاہور ❖ مکتبہ جمال کرم لاہور
❖ مکتبہ فیضان اولیاء کامونکہ ❖ فرید بک شال لاہور ❖ مسلم کتابوی لاہور
❖ مکتبہ فیضان مدینہ میلاد چوک ڈنگہ ❖ مکتبہ فیضان مدینہ ❖ لالہ موسیٰ رضا بک شاپ ❖ شاہ حسین روڈ گجرات
❖ مکتبہ قادریہ گوجرانوالہ ❖ مکتبہ رضائے مصطفیٰ گوجرانوالہ ❖ مکتبہ مہریرہ رضویہ ڈسکہ

جامعہ جلالیہ رضویہ مظهر اسلام

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انتساب

قائد اہل سنت، عالمی مبلغ اسلام، فاتح قادیانیت، مقرر شرعی بیان قاری خوش الحان

حضرت علامہ شاہ احمد نورانی رحمۃ اللہ علیہ

کے نام جن سے تمام باطل قوتیں اور باطل نظام کا نپتہ رہے۔

محمد اشرف آصف جلالی

جامعہ جلالیہ رضویہ مظہر اسلام

لاہور

(نوٹ) قائد اہل سنت مولانا شاہ احمد نورانی کا مختصر تذکرہ کتاب کے آخر میں ملاحظہ فرمائیں

یورپ میں اسلام کے پھلتے ہوئے اثرات

۱۹۹۵ء/۸/۱ کے عربی مجلہ المجمع سے ماخوذ

جب سے مسلمان روزگار اور اچھی زندگی بسر کرنے کی تلاش میں بڑا عظیم یورپ میں سکونت اختیار کر رہے ہیں، یورپ میں اسلامی اثرات بڑھتے جا رہے ہیں یہاں تک کہ اب اسلام کی ضیا پاشیوں نے پورے یورپ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ بڑے بڑے شہروں کی فضاؤں میں مساجد کے مینار بلند ہو گئے ہیں اور یورپ کے تمام اطراف و اکناف میں اسلامی مراکز کثیر تعداد میں قائم ہو گئے ہیں۔ فرانس کے ایک ماہر اعداد و شمار (Demography) جان کلوڈ تھیرنی کا کہنا ہے کہ یورپ عالم اسلام کا حصہ بن گیا ہے۔ مشرق وسطیٰ میں اسلام کے گہرے اثر و رسوخ کی وجہ سے مغربی انسان کے ذہن پر اسلامی اثرات پختگی سے مرتم ہوئے ہیں۔ یورپ کی داخلی کشمکش، مسلمان جس میں ایک فریق ہیں، وہ بوسنیا کی جنگ کی صورت میں واضح ہوئی ہے اور مسلمان اس میں عظیم قربانیاں دے رہے ہیں۔ شمالی افریقہ اور برصغیر پاک و ہند میں پائی جانے والی اسلامی بیداری نے بھی مغربی انسان کو مزید متاثر کیا۔ خصوصاً یہ تاثر تب مزید راسخ ہوا جب بدنام زمانہ ناول نگار ”سلمان رشدی“ نے اپنی کتاب میں اسلام پر تنقید کی تو مسلمانوں کے جذبات بھر گئے اور غیض و غصہ کی ایک لہر دوڑ گئی اور اس ضمن میں بعض حتمی فیصلے بھی صادر کر دیئے گئے۔

North Atlantic Treaty Organization (نٹو) کے

جنرل سیکرٹری ”ویلی کلایس“ اور برطانوی اہل کار ”ریمنجٹن“ تو بہت دور چلے گئے جب

انہوں نے مسلمانوں کی مذکورہ بیداری کو ”اسلامی انتہا پسندی“ قرار دیتے ہوئے اسے سیاسی اور جغرافیائی لحاظ سے مستقبل کا خطرہ قرار دیا ہے۔ اسی لئے مسلمانوں کی تعداد ایک تسلسل کے ساتھ بڑھنے پر یورپ کی اقتصادی حالت کمزور ہو رہی ہے۔ مسلمان دائیں بازو کی انتہاء پسند پارٹیوں کے متعصب فاشسٹوں کے حملوں کا ہدف اولیں بن رہے ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ یورپی باشندگان کی زندگیوں پر اسلام کا رنگ نمایاں نظر آنے لگا ہے۔ اس کے کئی محرکات ہیں جو پوری زندگی اور قومی ثقافت کے تمام معیاروں پر اثر انداز ہیں۔ یورپ کے اکثر بڑے شہروں میں مساجد، اسلامی مدارس، حلال گوشت کی دکانوں اور پاکیزہ سویٹ مارکیٹوں میں کئی گنا اضافہ ہوا ہے۔ ایک فرانسیسی سکالر جس نے ”اسلام اور مغرب“ اور ”مذہبی انتہا پسندی“ کے بارے میں متعدد کتابیں لکھی ہیں نے کہا ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ یورپ اسلام میں اور اسلام یورپ میں ہے۔ یہ امر واقعی ہے کہ اسلام یورپی زندگی کا ایک ایسا حصہ ہے جس کا اس سے علیحدہ ہونا ناممکن ہے۔ یہ بات خصوصاً اب مزید یقینی ہو گئی ہے جبکہ غالب کیتھولک آبادی والے ممالک مثلاً بلجیئم، فرانس، اٹلی اور سپین میں یہاں کے ”Protestant“ عیسائیوں نیز یہودیوں کی تعداد سے مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہو گئی ہے۔ فرانس میں مسلم آبادی ۲،۲ ملین، جرمنی میں بھی ۲،۲ ملین، برطانیہ میں ۳،۱ ملین اور مغربی یورپ میں محتاط اندازے کے مطابق ۸ سے ۱۰ ملین ہے اور آئندہ سالوں میں یہ تعداد مزید بڑھ جائے گی۔

یورپ جسے بوڑھوں کی شرح میں اضافے اور بچوں کی شرح میں کمی کا سامنا ہے اس کا زیادہ تر انحصار غیر ملکی ورکرز پر ہے۔ نہ صرف ارزاء کمیشن کی خاطر بلکہ اجتماعی

ریلیف تنظیموں کی معاونت کیلئے بھی۔ اکثر یورپی ممالک میں ورکرز شمالی افریقہ، مشرق وسطیٰ اور ترکی سے پہنچتے ہیں۔ یورپ میں اسلامی برادری غیر عادی طور پر بڑھ رہی ہے۔ صرف فرانس میں مسلم آبادی جن میں سے اکثر عرب ہیں آئندہ پندرہ سالوں کے درمیان ۶ سے ۸ ملین تک پہنچ جائے گی۔

یورپ بانجھ ہے لیکن غنی ہے۔ اس بارے میں تیزی نے کہا ہے کہ یورپ بانجھ ہے لیکن غنی ہے جبکہ عالم عرب کو آبادی کی ایسی کثرت کا سامنا ہے جس کی کوئی مثال نہیں ہے۔

یورپ میں مسلمان ایک نہیں ہیں کیونکہ وہ مختلف خطوں، نسلوں اور دینی طبقات سے تعلق رکھتے ہیں۔ کچھ شعائر اسلام کو مکمل جوش و جذبہ سے ادا کرتے ہیں اور بعض یا تو بغیر کسی جذبے کے ادا کرتے ہیں یا سیکولر (Secular) بن جاتے ہیں۔

فرانس میں جو گزشتہ سال ریفرنڈم کروایا گیا اس میں مسلمانوں کو چند امور میں سے بعض کو منتخب کرنے کیلئے کہا گیا۔ وہ تین پوائنٹ جن کو وہ اسلام کے زیادہ قریب سمجھ رہے تھے وہ ”جمہوریت“، ”عدالت“ اور ”حریت“ ہیں جبکہ غیر مسلموں نے انتہا پسندی جھکاؤ اور مغربی اقدار کو رد کرنے جیسی عبارات کو اختیار کیا۔ جو مسلمان آج بھی یورپ میں داخل ہو وہ وہاں کی کشیدگی کا مشاہدہ کر سکتا ہے۔ خصوصاً اس تاریخی شہر میں جو جبل طارق کے دامن میں واقع ہے۔ جبل طارق میں دونوں پہاڑوں کا درمیانی راستہ یورپ کی طرف ایک پل کی حیثیت رکھتا ہے۔ شمالی افریقہ سے آنے والے مسلمان جب اس شہر میں پہنچتے ہیں تو یہاں کے لوگ انہیں شک کی نظر سے دیکھتے ہیں جیسا کہ دکاندار انہیں اپنی دکانوں میں داخل ہونے سے روک دیتے ہیں۔

چند موروثی خدشات:

کچھ ایسے موروثی خدشات ہیں جن کی شدت اب یورپ کی کشیدہ فضاء میں نمودار ہونے لگی ہے اور مغرب اور اسلامی بیداری کے درمیان حالات کشیدگی کا رخ اختیار کر رہے ہیں۔ مسلمانوں اور عیسائیوں میں جذبات نفرت بہت بڑھ گئے ہیں اور ہر قسم کی افہام و تفہیم کا پہلو ختم ہو گیا ہے۔ اس دو طرفہ نفرت کے پس منظر میں اسلامی فتوحات، صلیبی جنگیں، قومی تحریکات و انقلابات اور دہشت گردی جیسے کئی عوامل کار فرما ہیں۔ حسد و بغض کے ان متواتر آثار کا مٹ جانا بہت مشکل ہے۔ ایک برطانوی خاتون کا رین امٹرونگ مؤلفہ ”الحروب المقدسہ“ و دیگر کتب نے کہا ہے کہ ہماری یورپ میں مسلمانوں کے ساتھ دشمنی کا آغاز صلیبی جنگوں سے ہوا اور وقتاً فوقتاً بڑھتی رہی۔

اس رویے میں تبدیلی اس وقت آئی جب یورپ کو اس کی شدید ضرورت نے ارزاں کمیشن مسلم ورکرز کی طرف مجبور کیا۔ اس کی ایک مثال دیکھئے کہ مذکورہ ضرورت نے ۱۹۶۴ء اور ۱۹۷۷ء کے درمیان بلجیئم کو مراکش اور ترکی کے ساتھ نقل مکانی کے خصوصی معاہدے پر متفق ہونے پر مجبور کیا اور بلجیئم نے ترکی اور مراکش کے باشندگان کیلئے اپنی ضرورت کے پیش نظر روزگار اور سکونت کے دروازے کھول دیئے۔ اس وقت ایک مسلمان جب اپنے وطن کو الوداع کہتے ہوئے اپنے اہل و عیال سمیت یورپ کے کسی ملک میں بھی جاتا تو اس کا پرتپاک استقبال کیا جاتا۔ ایسا ان تمام ممالک میں ہوتا رہا جو مسلم ایجنسیوں کو اطالوی، ہسپانوی اور پرتگالی ایجنسیوں کی جگہ کام میں لانا چاہتے تھے کیونکہ مذکورہ قومیتوں کے لوگ یورپ میں آباد ہوتے رہے اور ان کا اثر و رسوخ یہاں بہت زیادہ ہو گیا تھا۔

مسلم ورکرز کے یورپ میں استقبال کئے جانے کے متعلق بروکسل یونیورسٹی کی پروفیسر موریلی نے اقرار کیا ہے اس نے کہا کہ مسلم ورکرز کی بلجیئم میں آمد و سکونت بلجیئم کی اقتصادیات کیلئے ایک مرہم کی حیثیت رکھتی تھی۔ حکومت نے اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی پر ان کی بہت حوصلہ افزائی کی تا کہ معاشرے میں یک سوسائٹی ترقی کر سکے۔ ذرائع ابلاغ نوآمد مسلم ورکرز کو ایسی زندگی کی خوشخبریاں سنارہے تھے جس کا انہیں کبھی خواب بھی نہ آیا ہو۔ چنانچہ Advertisement کے جو کارڈ انہیں دیئے جاتے تھے ان پر جو عبارات رقم تھیں وہ یہ غمازی کر رہی تھی کہ بلجیئم خوشحال جنت ہے اس لئے کہ اس میں رہائشی سہولتیں بکثرت موجود ہیں۔ دیگر کئی ایسی عبارات تھیں جو نئے آنے والے حضرات کو برا بیچتے کر سکیں۔ مثلاً: آسان قرضوں کی فراہمی اور اولاد کی نگہداشت کا جدید طریقہ وغیرہ۔

پروفیسر موریلی نے مزید کہا کہ جس وقت سے لوگوں نے غیر ملکوں کی آمد اور آباد کاری کے مسئلے پر بحث شروع کر دی ہے یورپ کیلئے یہ پراہم صرف دین کے لحاظ سے ہی نہیں ہے بلکہ جس بات سے یورپ خائف ہے وہ یورپ کی طرف مسلمانوں کی نقل مکانی کی لہر ہے جیسا کہ فرانس کی ایک یونیورسٹی کے پروفیسر اولیفیہ نے کہا ہے کہ لیکن جو امر یورپ کیلئے تکلیف دہ ہے وہ یہ ہے یوں ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام دوسرے یورپی ادیان کے ساتھ مطابقت قبول نہیں کرے گا۔

یورپی وطنی تنظیمیں مسلمانوں کی جتھ بندی کے اضافے پر حرکت میں آ جاتی ہیں۔ اس صدی کے دسویں داکھ کی ابتداء میں جرمنی میں فسادات اٹھ کھڑے ہوئے جنہوں نے غیر ملکی باشندوں سے پیدا شدہ نفرت کا اظہار کیا، کیونکہ اس وقت ایک آواز

بلند ہو رہی تھی کہ جرمنی میں غیر ملکیوں کا داخلہ بند کیا جائے۔ ان حالات میں جرمنی میں مقیم غیر ملکی باشندوں نے سخت ایکشن لیا اور جب جرمن سماج نے ترک باشندگان کے بیٹوں پر اپنے دروازے بند کر دیئے اور انہیں جرمنی کی بعض نازی تنظیموں نے اپنا نشانہ بنایا تو وہاں مقیم مسلمان برلن کی سڑکوں پر ظالموں کے تعاقب کیلئے اکٹھے ہو گئے اور ترک جوانوں کے کئی گروہوں نے دوسری اسلامی تنظیموں کے ساتھ تعاون لینے کیلئے رابطے کئے تاکہ وہ کوئی بڑا کارنامہ سرانجام دے سکیں۔

اجتماعی نزاع:

اجتماعی کشمکش مذکورہ پر اہل علم کا ایک بڑا حصہ ہے۔ اسلام ایک عقیدے اور دین کی حیثیت سے یورپ میں بڑے عروج پر ہے جبکہ عیسائیت کا سورج زوال پذیر ہے اس کا سبب اس کا مصدر الہام ہونا اور نفسی راحت ہے۔ ایک سابقہ راہبہ امسٹر وگ کا کہنا ہے ”ہم کسی بھی دین کے پیروکاروں کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں“۔ جب کمیونزم نے دم توڑا اور فاشزم صرف ابتدائی سیاست کا نظام ٹھہرا تو مغرب آئیڈیالوجی سے مفلس ہو گیا تو وہ فطری طور پر اپنے دشمن تلاش کرنے لگا۔ جوں ہی سوویت یونین کا خاتمہ ہوا برطانیہ کو اسلامی روشنی کی طرف سے شدید فکر لاحق ہونے لگی کیونکہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ترک وطن کے بعد یورپ کو اپنا وطن بنا چکی ہے۔ امسٹر وگ نے مزید کہا ”قریب ہے کہ ان دنوں میں اسلام کے خلاف سرد جنگ کی جگہ نظریاتی جنگ لے لے“۔

اس اجتماعی کشمکش کی ایک کڑی وہ واقعہ ہے جو لندن کے مشرق میں واقع ایک مرکزی جامع مسجد میں پیش آیا یہ مسجد ایک پرانے کنیسہ ”بریک لین“ سے چند قدم ہی دور ہے۔

۱۹۹۰ء میں نازی تنظیموں کے اراکین نے اس مسجد کے مرکزی گیٹ پر خنزیر کی کھوپڑیاں اور بڑی تعداد میں خون سے لت پت خنزیر کا گوشت پھینک دیا۔ مسجد کی مجلس منظمہ نے اس وقت اس واقعہ کو صحافتی حلقوں تک نہ پہنچنے دیا اور نائب امام سید مومن الدین نے یہ کہہ کر بات ٹال دی کہ ”نسل پرست عناصر شہرت کے بھوکے ہیں اور ہم ہر گز ان کو شہرت نہیں بخشیں گے“ لیکن طویل مدت تک اس واقعے کا پردہ اخفا میں رہنا ممکن نہیں تھا یہاں تک کہ ۱۹۹۲ء میں کسی نامعلوم آدمی نے مسجد کے کافر نس ہال میں آگ لگا دی جس نے ہال کے اندر موجود تمام ساز و سامان ہڑپ کر لیا۔ اگر لندن فائر بریگیڈ کا عملہ جلدی سے کارروائی نہ کرتا تو بہت بڑا حادثہ پیش آ سکتا تھا۔

جرمنی کی طرف مسلمانوں کی نقل مکانی کی تاریخ:

جرمنی میں اس وقت مسلمانوں کی تعداد ۲ ملین ہے۔ جرمنی میں مسلم آبادی کا آغاز آج سے ۳۰ سال قبل اس وقت ہوا تھا جب ترک کام کی غرض سے جرمنی میں داخل ہوئے۔ اس وقت یہی سمجھا جا رہا تھا کہ یہ ورکرز جرمنی میں عارضی طور پر ایک معین مدت تک رہیں گے لیکن وہ تو وہیں کے ہو کر رہ گئے اور اب ان کی تیسری پود کی ولادت بھی جرمنی ہی میں ہو رہی ہے۔

ان ترک مہاجرین کے اکثر بچے ترکی کی بنسبت جرمن زبان بڑی مہارت سے بول لیتے ہیں اور جب کبھی یہ لوگ ترکی کی سیروساحت کیلئے ترکی جائیں تو وہاں اجنبیت محسوس کرتے ہیں لیکن یہ لوگ جرمن نیشنلٹی (Nationality) حاصل کرنے میں ناکام رہے ہیں۔

اب حالات روز بروز تبدیل ہوتے جا رہے ہیں۔ جرمن مشیر ہیلمٹ کول اور

بعض دوسرے جرمن سیاسی زعماء اس بات پر اصرار کر رہے ہیں کہ جرمنی جرمینوں کیلئے ہے یہ غیر ملکوں کا دارالہجرت نہیں ہے۔ لیکن جرمنی میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو ان آباد شدہ مسلمانوں کے جرمنی میں رہنے کے حامی ہیں یہاں تک کہ مسیحی ڈیموکریٹک پارٹی (Democratic Party) جس کے صدر مذکورہ مشیر کول ہیں کے بعض عہدیدار بھی مسلمانوں کی وہاں بقا کے حامی ہیں۔

جب اس صدی کے دسویں دہاکے کی ابتداء میں جرمنی میں مہاجرین کے مسئلے پر شدت پیدا ہوئی اور مشرقی یورپ میں مہاجرین کی بہتات پر پابندی لگانے کیلئے سوچا گیا تو ان حالات میں جرمن نیشنلیٹی (Nationality) کی بعض سخت شرائط کو نرم کیا گیا جن کا پہلے زیادہ مدار جرمنی الاصل ہونے پر تھا تو ۱۹۹۰ء سے لے کر اب تک جرمن نیشنلیٹی حاصل کرنے والے ترکوں کی تعداد میں ۲۰۰۰۰ سے ۴۰۰۰۰ تک اضافہ ہوا اور ”بار باراجون“ جو کہ بیرونی ممالک سے آنے والے حضرات کے امور کی برلن میں کمشنر ہے اس کا کہنا ہے کہ ”آج ہم جرمنی میں آکر مقیم ہو جانے والے مسلمانوں کی اولاد کی اس پود کا مشاہدہ کر رہے ہیں جو ہمیشہ کیلئے یہیں رہنے کے خواہشمند ہیں۔ یہیں اپنا مستقبل استوار کر رہے ہیں اور یہاں وہ اجنبیوں کی طرح زندگی بسر کرنا قبول نہیں کرتے بلکہ وہ اپنے آپ کو یہاں کا مستقل شہری قرار دیتے ہیں۔“ جرمنی کا ایک قانون ہے جسے ابھی تک نافذ نہیں کیا گیا جسے مزید شفاف کرنے کی ضرورت ہے اور اس میں جرمنی میں دائمی طور پر مقیم حضرات کیلئے نیشنلیٹی (Nationality) کے مسئلے میں ایک گونہ لچک ہے۔ سیم اوزد میر وہ پہلا ترک باشندہ ہے جس نے جرمنی کی شہریت حاصل کی اور الیکشن میں جرمنی پارلیمنٹ (Parliament) کا رکن منتخب ہو گیا۔ وہ پارلیمنٹ

میں اپنی پارٹی (انصار الہدیہ) کی نمائندگی کرتا ہے۔

اقتصادی لحاظ سے ترک برادری جرمن معاشرے میں گھل مل گئی ہے۔ ترکوں نے جرمنی میں ۳۷۰۰۰ فر میں قائم کی ہیں اور ۱۳۵۰۰۰ افراد کو روزگار مہیا کیا ہے جن میں سے ۱۵% جرمن باشندے ہیں۔ اتنی کارکردگی اور بعض چکدار قوانین کی موجودگی میں بھی جرمنی میں موجود اسلامی برادری میں سے صرف ۲% لوگوں کو جرمن نیشنلٹی ملی ہے۔

برطانیہ میں صورتحال اس کے برعکس ہے کیونکہ برطانیہ میں مقیم اسلامی برادری کے ۷۵% افراد نے برطانوی نیشنلٹی حاصل کر لی ہے اور بقیہ مسلم آبادی کے افراد ابھی تک برطانیہ کے شہری نہیں بنے بلکہ ان سے اقلیات سا معاملہ کیا جاتا ہے جیسا کہ وہاں سوڈان، پاکستان، بھارت اور بعض دیگر ممالک کے لوگ ہیں۔

برطانوی اقتدار ان تمام کو برطانوی معاشرے میں منضم ہو جانے پر زور دیتا ہے تاکہ وہ افراد کی بجائے جماعتوں کی شکل میں برطانوی معاشرے کا حصہ بن جائیں اور دینی تعصب کی بناء پر بعض مسلمانوں سے امتیازی سلوک بھی کیا جاتا ہے۔ عدم توجہ کی سیاست جن کا طریقہ برطانوی حکومت نے نکالا ہے اور ان کی دیگر ترجیحات مذکورہ انضمام کی سمت ایک کوشش ہیں۔

اور پھر یہ بات بھی ہے کہ مسلمان وہاں اپنا سیاسی اثر و رسوخ استعمال بھی نہیں کرتے حالانکہ برطانیہ میں مسلمانوں کی کثیر آبادی ایک خاص اہمیت کی حامل ہے۔ اور یہ وجہ بھی ہے کہ برطانوی پارلیمنٹ میں مسلمانوں کی کوئی قابل ذکر نمائندگی بھی نہیں۔ صرف ایک آدمی جس کا تعلق بھارت سے ہے وہ کیتھولک کانائب ہے اور مسلمانوں کی کوئی ایسی ملک گیر تنظیم نہیں ہے جو تمام اسلامی برادری کی نمائندگی کر سکے۔

اس امر کا اظہار لندن کی اسلامی یونیورسٹی سے جناب زکی البدری نے کیا ہے کہ ہم میں سے ہر ایک نے اپنے آپ کو ۲، ۳ یا ۱۰ آدمیوں کی نمائندگی کیلئے کھڑا کر رکھا ہے۔ ہم سب کو ایک عقیدہ ایک لڑی میں پروتا ہے نہ کہ ایک ثقافت اور اس عقیدہ کی ہم آہنگی کی وجہ سے ہم میں سے ہر ایک یہاں ایسی زندگی بسر کر رہا ہے جیسے وہ اپنے دیہات میں زندگی بسر کر رہا ہو۔

فرانسیسی حکومت امتزاج اور انضمام کیلئے بڑے وسیع پیمانے پر کام کر رہی ہے۔ وہ وہاں موجود تمام مسلمانوں کو فرانسیسی کٹھالی میں ڈھال دینا چاہتی ہے۔ نظام حکومت ہر قسم کی تفریق کو خطرہ سمجھتا ہے خواہ وہ رنگ و نسل یا دین یا اور کسی بنیاد پر ہو۔

حتیٰ کہ اس لحاظ سے اعداد و شمار کو بھی پسند نہیں کیا جاتا جیسا کہ شیزنی نے کہا ہے ”اقلیات کے وجود کی سوچ نسل پرستی ہے جس کا دروازہ بند کیا جا چکا ہے دستور بھی اس کی اجازت نہیں دیتا۔ امتزاج اور انضمام کی سیاست کامیاب ہے۔“ پھر وہاں آباد مسلمانوں کی عادات کا بھی مسئلہ ہے اور اس ضمن میں عورتوں کے معاشرے میں کردار پر زور دیا جاتا ہے کیونکہ حکومت اور صحافت مسلم خواتین پر سے ثقافتی پابندی اور ان کے بقول عورتوں پر مسلط کی گئی قید ختم کرنے کی ضرورت پر زور دیتی ہیں۔

فرانس میں مسلم خواتین کا پردہ:

گزشتہ چھ سالوں سے فرانسیسی مدارس میں پردے کے موضوع پر بہت گرمی ہوئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان سمجھتے ہیں کہ پردہ مسلمان عورت پر فرض ہے جبکہ فرانس جیسی سیکولر حکومت اس میں اپنی توہین سمجھتی ہے۔ ۸۲ سالہ شیخ عبدالباقی صحراوی نے فرانس کے مذکورہ نکتہ نظر پر تنقید کرتے ہوئے کہا ہے ”فرانسیسی حکومت

چاہتی ہے کہ مسلمان لازمی طور پر ان کے ساتھ مل کر دوسرے درجے کے فرانسیسی شہری بن جائیں اور اپنی اسلامی تعلیمات سے دستبردار ہو جائیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب ایک مسلمان فرانس کا شہری بننا چاہتا ہو تو وہ ضرور شراب نوشی کرے۔

بہر حال یورپ میں ایسی دوریاں اور امتیازات بڑھتے جا رہے ہیں اور اس کشمکش کا خاتمہ بہت مشکل ہے کیونکہ یہ دو دشمن تہذیبوں کا باہمی جھگڑا ہے جو صدیوں سے ایک دوسرے کے خلاف نفرت کے جذبات چھپائے ہوئے ہیں۔

لیکن اگر یورپ ان دو تہذیبوں کو صحیح منہج میں رکھنے میں کامیاب نہ ہو تو آئندہ چند سالوں میں اسے شدید بحرانوں کا سامنا ہوگا۔

=====